شاہ ولی اللہ کا نظریۂ تقلید

SHAH WALIULLAH'S THEORY OF TAQLID

سعید احمد سعیدی* / محمد اعجاز**

Abstract:

Shah Waliullah is the leading scholar of 18th century who is famous for his revivalist and Ijtihadi ideas. He played a vital role in harmonizing the conflicting trends of various sects. In order to achieve the target, he composed many books and commentaries. For instance, he wrote al-Masawwa –a commentary on al-Mutta to make conformity between Hanafi and the Shafi'i jurisprudential differences. Later on, he wrote Musaffa- another commentary on al- Mutta to create ways of proximity among four famous schools of thoughts. His writings reflect his Ijtihadi approach. He also criticized taqlid or blind following or imitation. It is necessary to understand the definition and limitation of taqlid in the in his theory. This article attempts to evaluate Shah Waliullah's theory of Taqleed. In this article, some issues also are discussed in which jurisprudential differences exist since the early period of Islam. The present study also contains that for whom imitation is forbidden in the theory of Shah Waliullah. This research helps to determine the nature of Shah Waliullah theory of Taqlid.

Keywords: Shah Waliuallah, Theory of Taqlid and Ijtihad, South Asian Muslim Revival Movements.

زوال، ایک سیلاب کی طرح ہوتا ہے جس کی زد میں نشیب و فراز دونوں آتے ہیں۔ عصبیت، شدت پسندی اور فرقہ پرستی اس کے عام مظاہر ہیں۔ اجتہادی بصیرت تقریباً مفقود ہو جاتی ہے اور تقلیدِ جامد کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں دوسرے کے نقطہ نظر کو برداشت کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اور معاملہ فتنہ و فساد اور مرنے مارنے پر منتج ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ایسے ہی کے حالات کے پیش نظر مختلف مذاہب فقہ کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے غیبی اشارے انہیں بارگاہِ نبوی ﷺ سے نصیب ہوئے۔ سب سے پہلے فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو قریب لانے کے لیے انہوں نے ''المسوّی شرح الموطا'' تصنیف فرمائی۔ بعد ازاں ان کی طرف سے مذاہب اربعہ کے مابین قربت کی راہیں پیدا کرنے کے لیے ''مصفّی شرح موطا'' منصۂ شہود پر آئی۔ بد قسمتی سے شاہ صاحب کی ان تطبیقی مساعی کو بھی فکری انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور ہر نقطہ نظر کے حامل افراد نے

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، ادارہ علومِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

** پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور

اپنے اپنے مطلب کی عبارات لیں اور ان کے اوپر استدلالات کی عمارتیں کھڑی کر دیں۔ ایک گروہ تو اس حد تک آگے بڑھا کہ شاہ صاحب کو تقلید کا مخالف قرار دے دیا جبکہ دوسرا گروہ انہیں تقلیدِ جامد کا حامل و مبلغ قرار دینے لگا اور ہر گروہ کی طرف سے اپنے اپنے موقف کی تائید میں افراط و تفریط سے بھرپور لٹریچر منظر عام پر آنے لگا۔

اس امر کا جائزہ لینے کی از حد ضرورت ہے کہ تقلید کے بارے میں شاہ صاحب کا حقیقی نقطہ نظر کیا ہے؟ ذیل میں اس امر کا جائزہ لینے کی ایک طالب علمانہ سی کوشش کی گئی ہے۔

تقلید کا لفظ "قلادۃ" سے ماخوذ ہے، جس کا لغوی معنی ہے "ہار"، اسی لیے تقلید کے لغوی معنی ہوں گے ہار پہنا دینا اصطلاحی طور پر تقلید "العمل بقولِ الغیر من غیر حجۃ ملزمۃ"[1] سے عبارت ہے۔

تقلید کا حکم

احکامِ شریعت کے فروعی مسائل میں تقلید کے بارے میں حسبِ ذیل نکتہ ہائے نظر ملتے ہیں:

۱- مطلقاً ناجائز ہے چنانچہ ابنِ حزم نے حرمتِ تقلید پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔[2]

۲- مطلقاً واجب ہے۔ یہ بعض حشویہ کا مذہب ہے۔[3]

۳- عامی کے لیے واجب ہے، مجتہد کے لیے حرام ہے۔ ائمہ اربعہ کے متبعین کی اکثریت اسی کی قائل ہے۔[4]

تقلید کے بارے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر

تقلید کے بارے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر "عقد الجید"، "الانصاف"، "حجۃ اللہ البالغۃ" اور "التفہیمات الالٰہیۃ" وغیرہ میں ملتا ہے۔

"الانصاف" میں آپ فرماتے ہیں:

"معلوم ہونا چاہیے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگ فقہ کے ایک معین مذہب کی تقلید پر متفق نہ تھے۔ ابو طالب مکی کی کتاب "قوت القلوب" کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ کتابیں اور رسائل کے مجموعے بعد کی چیزیں ہیں، لوگوں کے اقوال بیان کرنا اور ایک خاص شخص کے فقہی مذہب پر فتویٰ دینا اور ہر بات میں اس کے قول اور روایت کو اختیار کرنا اور اس کے مذہب پر بھروسہ کرنا، پہلی اور دوسری صدی میں لوگوں کا معمول نہ تھا بلکہ اس دور میں لوگوں کے دو طبقے تھے:

(i) طبقہ علماء (ii) طبقۂ عوام

عوام کے بہتر اشخاص کا یہ حال تھا کہ وہ متفق علیہ مسائل میں، جن کے بارے میں مسلمانوں کے اندر یا جمہور مجتہدین میں کوئی اختلاف نہ تھا، وہ شارع علیہ السلام کے سوا کسی اور کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ وہ وضو اور غسل کی کیفیت اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اپنے آباء و اجداد یا اپنے اپنے شہر کے اساتذہ سے سیکھتے تھے اور

اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب انھیں کوئی نادر اور غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جس عالم / مفتی کو پاتے بلالحاظِ مسلک اُس سے فتویٰ پوچھ لیتے۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے ان کے دو درجے تھے:

۱- ایک وہ عالم جنھوں نے قرآن، سنت اور آثار کے تتبع میں اتنی محنت و کوشش کی کہ تجربہ کی بناپر انھیں ایسا ملکہ حاصل ہو گیا کہ وہ لوگوں میں مفتی بن سکتے تھے یعنی لوگوں کو جو واقعات پیش آتے تھے اُن کے بارے میں وہ فتویٰ دے سکتے تھے اور وہ امور جن کے متعلق وہ جواب دیتے تھے، وہ اُن امور کی نسبت زیادہ ہوتے تھے جن میں وہ توقف کرتے تھے۔ یہ لوگ ''مجتہد مطلق'' کے نام سے موسوم تھے۔

۲- دوسرے وہ عالم تھے جن کو قرآن و سنن کی اتنی معرفت حاصل تھی جس سے وہ فقہ کے اصول اور اُس کے بنیادی مسائل کو اُن کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جان سکتے تھے بعض مسائل ایسے تھے جن میں انھیں دلائل کے ذریعے ایک واضح اور غالب رائے حاصل ہو جاتی تھی اور بعض کے متعلق وہ توقف کرتے۔ مؤخر الذکر مسائل کے بارے میں وہ علماء سے مشورہ کرنے کے محتاج ہوتے کیونکہ ان کے متعلق کسی واضح اور غالب رائے تک پہنچنے کے لیے اُن کے پاس پوری طرح وہ وسائل نہیں تھے جو مجتہد مطلق کے پاس تھے چنانچہ یہ علماء بعض مسائل میں مجتہد تھے اور بعض میں غیر مجتہد۔

صحابہ و تابعین سے یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب انھیں کوئی حدیث مل جاتی تو وہ غیر مشروط طور پر اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے تھے لیکن دو صدیوں کے بعد لوگوں میں کسی نہ کسی معین فقہی مذہب کو اختیار کرنا عام ہو گیا چنانچہ بہت کم لوگ ایسے تھے جو کسی خاص معین مجتہد کے مذہب کے پابند نہ ہوتے۔ اس زمانے میں تقلید ایک امر واجب ہو گئی۔[۵]

تقلید اَمر واجب کیوں قرار پائی؟

شاہ صاحب نے ''تقلید امر واجب کیوں قرار پائی''؟ کی تین وجوہات بیان کی ہیں:

اس کا سبب یہ ہے کہ فقہ سے وابستگی رکھنے والے کو دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں:

۱- ایک یہ کہ اُس کی تمام توجہ اس طرف مبذول رہے کہ وہ ایسے مسائل سے واقفیت حاصل کرے جن کا جواب مجتہدین تفصیلی دلائل کے ساتھ پہلے ہی دے چکے ہیں، ان پر تنقید کرے، ان کے مآخذ کی تحقیق کرے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور اُس وقت کامیابی سے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا جب تک ایسے فقیہ کو کسی ایسے امام مجتہد کی راہنمائی میسر نہ ہو جس نے فقہی مسائل کو الگ الگ شعبوں میں پھیلا کر بیان کرنے اور ان کے دلائل مہیا کرنے کی زحمتوں سے اُس کو بے نیاز نہ کر دیا ہو۔

۲- اہل فقہ کو دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے کہ اُس کی ساری توجہ اس طرف مرکوز ہو کہ وہ ان مسائل پر دسترس پالے جن کو فتویٰ پوچھنے والے اس سے دریافت کریں اور جن کے متعلق علمائے سلف کا کوئی قول منقول نہ ہو۔ ایسا فقیہ ایک ایسے امام کی اقتداء کا مذکورہ بالا فقیہ سے بھی زیادہ محتاج ہے جس کے مرتب کردہ فقہی اصولوں سے وہ فائدہ حاصل کر سکے کیونکہ فقہی مسائل باہم ایک دوسرے سے وابستہ و مربوط ہیں اور ان کی فروع اور جزئیات کا تعلق اُن کے مآخذ سے ہے۔

ایسی صورت میں اگر کوئی شخص خود تمام مذاہبِ فقہ کی جانچ پڑتال اور اُن کے متعلقہ اقوال کی چھان بین از سرِ نو شروع کر دے تو یہ نہ ہو سکے گا اور تمام عمر اس سے عہدہ بر آنہ ہو سکے گا۔ پس اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر اُس کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ جن مسائل کا جواب دیا جا چکا ہے ان ہی پر غور و فکر کرے اور ان کو سامنے رکھ کر مزید جزئیات اخذ کرے۔ پہلی قسم کے مجتہد کو "اَصحاب الوجوہ" اور دوسری قسم کے مجتہد کو "مجتہد فی المذہب" کے نام سے شاہ صاحب نے موسوم کیا ہے اور یہی مذکورہ بالا دو صورتیں عملاً فقہ کے طالب علم کو پیش آسکتی ہیں۔

۳- ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص اوّل تو یہ کوشش کرے کہ اس سے پہلے کون کون سے مسائل پیش آچکے ہیں اور پھر اس میں لگ جائے کہ اُن میں سے کون سا مسئلہ قابل استنباط اور اس کے نزدیک درست ہے۔ یہ صورت غیر متوقع اور ناممکن ہے کیونکہ نزولِ وحی کو ایک مدت ہو چکی ہے اور وہ وقت گزر چکا جبکہ ہر عالم کا لازمی طور پر بکثرت حالات میں یہ جاننا ضروری تھا کہ کون سی حدیث کتنے طرق اور کن عبارتوں میں روایت کی گئی؟

کون سا راوی کس پایہ کا ہے؟

کون سی حدیث صحیح یا ضعیف ہے؟

مختلف احادیث و آثار میں مطابقت کیسے کی جائے؟ اور

اس اَمر کی واقفیت کہ کون سی احادیث فقہ کا مأخذ ہیں؟ اور اسی طرح غریب الفاظ اور فقہ کے اصولوں کی پہچان وغیرہ۔

یہ سب کام ایسے ہیں جن میں متقدمین سے استفادہ کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور اگر ان اُمور میں اپنی زندگی ختم کر ڈالیں تو مزید مسائل ضرور یہ کی تفریع کیسے ممکن ہے؟ جبکہ انسانی دماغ خواہ وہ کتنا ہی ذہین ہو اس کی صلاحیتوں کی ایک حد متعین ہے جس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہاں، یہ کمال اُن علماء کو ضرور حاصل تھا جو باعتبار زمانہ بزمِ اجتہاد کی صفِ اوّل میں تھے کیونکہ وحی کا زمانہ گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور علوم کی یہ گونا گونی اور فراوانی نہ تھی لیکن اس کے باوجود یہ کمال چند نفوس سے زیادہ کو حاصل نہ ہو سکا اور وہ اس کے

باوجود اپنے اساتذہ کے پیرو تھے اور اُن پر اعتماد کرتے تھے لیکن چونکہ اس علم میں انھوں نے کافی تصرفات کیے اس لیے وہ مستقل مجتہد قرار پائے۔

مختصر یہ کہ ائمہ مجتہدین کے مذہب کو اختیار کرلینا ایک قدرتی تحریک تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء کے دِلوں میں ڈالا اور وہ شعوری یالاشعوری طور پر کسی ایک مذہب پر متفق ہوگئے۔[۶]

شاہ صاحب کی مذکورہ بالا افراط و تفریط سے پاک بصیرت افروز رائے کا معاند کے علاوہ کون انکار کرسکتا ہے؟ شاہ صاحب تو مذاہبِ اربعہ کی تقلید اور اُن کے دائرہ سے نہ نکلنے کو اللہ تعالیٰ کی حکمت قرار دے رہے ہیں۔ یہی بات شاہ صاحب نے ''فیوض الحرمین'' میں بھی کی ہے:

''... دوسرا اَمر جس کے لیے مجھے کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ میں فقہ کے یہ جو چار مذاہب ہیں، اُن کا پابند رہوں اور ان کے دائرہ سے باہر نہ نکلوں ...''[۷]

ایک شریعت کے ہوتے ہوئے وقت بدلنے سے امر غیر واجب، واجب ہوسکتا ہے؟

اعتراض: (ان دلائل کی روشنی میں کہ ابتدائی دوصدیوں میں کسی معین فقہی مذہب کو اختیار کرنے کا دستور نہ تھا اور تیسری صدی میں کسی نہ کسی معین فقہی مذہب کو اختیار کرنا عام ہوگیا اور یہ چیز ایک امر واجب قرار پائی) کہا جاسکتا ہے کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں کوئی چیز واجب نہ ہو اور دوسرے وقت میں وہی چیز واجب ہوجائے درآنحالیکہ شریعت ایک ہی ہے؟

الجواب: یہ اعتراض کہ مجتہدِ مستقل کی اقتداء پہلے واجب نہ تھی پھر واجب ہوگئی اس میں تناقض ہے جو اپنی نفی خود کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امر واجب دراصل یہ ہے کہ اُمت میں کوئی شخص ایسا ہو جو فروعی احکامِ شریعت کا علم اس کے تفصیلی دلائل کے ساتھ رکھتا ہو۔ اس پر سب اہل حق متفق ہیں اور جس بات پر کوئی امر واجب موقوف ہو وہ بات بھی واجب ہوتی ہے اور جب ادائے واجب کے متعدد طریقے ہیں تو اُن میں سے کسی ایک طریقہ کا اختیار کرنا واجب ہوگا۔ اس کے لیے کسی خاص طریقہ کا تعین لازمی نہیں اگر اس کا ایک ہی طریقہ ہو تو خاص اُس طریقہ کا حصول واجب ہوگا۔

چند مثالوں کے ذریعے وضاحت

۱- جیسا کہ ایک شخص بھوک کی شدت میں مبتلا ہو اور اس کے باعث اُسے ہلاکت کا ڈر ہو اور بھوک دور کرنے کے مختلف طریقے اُس کے بس میں ہوں مثلاً کھانا خرید سکتا ہو، جنگل سے پھل توڑ سکتا ہو اور کھانے والے جانور شکار کرسکتا ہو تو اُس کے لیے ان متعدد طریقوں میں سے بلاتعین کسی ایک کو اختیار کرنا واجب ہوگا لیکن اگر وہ شخص ایسے مقام پر ہو جہاں نہ شکار ہو نہ پھل تو اُس کے لیے ایک ہی طریقہ کہ مال خرچ کرکے کھانا خریدے، واجب ہے۔ اسی طرح اسلاف کے پاس اس واجبِ اصلی (یعنی اجتہاد) کو حاصل کرنے کے

چند طریقے تھے اور ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرنا واجب تھا۔ کسی خاص طریقہ کا تعین ضروری نہ تھا پھر جب سوائے ایک طریقہ کے باقی طریقے ختم ہو گئے تو یہی مخصوص طریقہ واجب رہا۔

۲- سلف میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں لیکن آج احادیث کا لکھنا واجب ہے کیونکہ آج ان کتب احادیث کے سوا حدیثوں کی روایت کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔

۳- اسی طرح اسلاف حصولِ علم نحو و لغت میں مشغول نہ ہوئے تھے کیونکہ عربی اُن کی اپنی زبان تھی اور انھیں ان علوم میں سر کھپانے کی حاجت نہ تھی لیکن آج عربی زبان کا علم باقاعدہ حاصل کرنا واجب ہو گیا کیونکہ سابقہ اہلِ عرب کا زمانہ بہت دور چلا گیا۔[۸]

امامِ معین کی تقلید کا حکم

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''اسی پر ایک معین امام کی تقلید کے واجب ہونے کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ ایک معین امام کی تقلید کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی واجب نہیں ہوتی مثلاً اگر ایک جاہل شخص ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی خطہ میں ہو اور اس کے قریب کوئی شافعی، مالکی یا حنبلی عالم موجود نہ ہو، نہ اُن کے مسالک فقہ کی کوئی کتاب ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ کے مذہب کی تقلید کرے اور اس سے باہر جانا اس کے لیے حرام ہو گا اس لیے کہ اُس وقت اگر اُس نے ایسا کیا تو وہ اپنے آپ کو دائرۂ شریعت سے نکال لے گا اور شتر بے مہار بن کر رہ جائے گا بخلاف اس کے کہ اگر وہ حرمین میں ہو تو چونکہ وہاں اُسے تمام مذاہبِ فقہ کی معرفت میسر ہو گی۔ اس لیے اُس کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ کسی غیر معتبر مسلک اور ظنی بات پر عمل کرے۔ نہ وہ عوام کی زبان سے نکلی ہوئی سنی سنائی پر عمل کرے اور نہ کسی غیر معروف کتاب سے کوئی قول اختیار کرے۔''[۹]

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جہاں تک نفسِ تقلید کا تعلق ہے، شاہ صاحب اس کے مخالف نہیں بلکہ اُسے جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابنِ حزم کے حرمتِ تقلید کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جو شخص رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے دین کو مانتا ہو اور صرف اسے حلال و حرام سمجھتا ہو جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال اور حرام کر دیا ہے لیکن نہ اُسے یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا اور نہ اس کا علم ہو کہ کلامِ نبوی سے استنباط کا کیا طریقہ ہے؟ اور اس بنا پر وہ کسی عالم راشد کی، یہ سمجھ کر پیروی کر لیتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے یا جو وہ فتویٰ دیتا

ہے وہ بظاہر درست ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کا متبع بھی ہے لیکن جب بھی وہ اپنی قائم کردہ رائے کے خلاف دیکھتا ہے تو کسی جدال یا اصرار کے بغیر فوراً اُس کی تقلید ترک کر دیتا ہے تو اس قسم کی تقلید کا کوئی شخص کیسے انکار کر سکتا ہے درآنحالیکہ استفتاء اور افتاء کا یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے مسلمانوں میں چلا آرہا ہے؟"[۱۰]

شاہ صاحب ایک غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس طرح کی تقلید کو کیسے ناجائز کہا جا سکتا ہے حالانکہ ہمارا اُس فقیہ کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ اُس پر فقہ کی وحی بھیجتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُس کی اطاعت ہم پر فرض کر دی ہے اور وہ بالکل معصوم ہے۔ اگر ہم کسی فقیہ کی اتباع صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا عالم ہے، اس کی رائے اور فتویٰ قرآن اور سنت کے کسی واضح حکم اور نص کے مطابق ہو گا یا ان دونوں میں سے کسی کی نص سے مستنبط ہو گا یا اُس عالم نے قرآن و سنت میں موجود قرائن سے کوئی حکم معلوم کیا ہو گا کہ یہ حکم فلاں صورت میں فلاں علت کی وجہ سے ہے اور اس کو اپنی ساری کوشش اور معرفت پر اطمینان قلب حاصل ہوا ہو گا ۔اس بنیاد پر اُس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا اس کا یہ سارا عمل اس بات کا گواہ ہے کہ گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ جہاں تم یہ علت پاؤ وہاں یہ حکم ہو گا اور جس مسئلہ میں قیاس کیا گیا ہے وہ اس عموم میں داخل ہے لہٰذا یہ بھی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہے لیکن اس کا طریق کار شک و شبہ سے خالی نہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی بھی صاحبِ ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔

اب اگر ہمیں اس امام کے مسلک کے خلاف صحیح اور مستند سند سے کوئی حدیث ملی اور ہم نے اس حدیث کو چھوڑ کر امام و مجتہد کی رائے اور مذہب کو ترجیح دی اور اس پر جمے رہے تو ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا کیونکہ حدیثِ رسول ﷺ کی پیروی ہم پر فرض ہے جب کہ کسی امام اور مجتہد کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اگر ہم اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کو چھوڑ کر کسی (امام، فقیہ یا مجتہد) کے اقوال و آراء کی پیروی کریں گے تو اُس روز کیا عذر ہو گا جب اللہ رب العٰلمین کے حضور تمام انسان کھڑے ہوں گے۔"[۱۱]

کن لوگوں کے لیے تقلید امر واجب ہے؟ اس حوالہ سے شاہ صاحب کا نقطۂ نظر جاننے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کا ذکر بھی کر دیا جائے جن کے لیے تقلید حرام ہے۔

کن لوگوں کے لیے تقلید حرام ہے؟

شاہ صاحب چار قسم کے لوگوں کے لیے تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں:

۱- وہ شخص جسے خود ایک گونہ اجتہاد حاصل ہو، خواہ ایک ہی مسئلہ میں ہو۔[۱۲]

۲- وہ شخص جس پر صاف ظاہر ہو گیا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا اور اس کی ممانعت فرمائی اور اُسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ امر یا نہی منسوخ بھی نہیں بایں طور کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ میں احادیث اور مخالف و موافق کے اقوال کا تتبع کرے اور اسے منسوخ نہ پائے یا یہ دیکھے کہ علوم میں تبحر رکھنے والوں کا جمِ غفیر اسی کو اختیار کرتا ہے اور مخالف کے پاس، قیاس یا استنباط جیسے دلائل کے علاوہ اور کوئی حجت نہیں تو ایسی صورت میں باطنی نفاق یا ظاہری حماقت کے علاوہ حدیثِ رسول ﷺ کی مخالفت کا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔[۱۳]

ظاہر ہے کہ یہ بات شاہ صاحب نے اُس عالم کے لیے کہی ہے جس کا مرتبہ مجتہد کی سطح سے پست اور عامی کی سطح سے بلند ہو۔ مجتہد کی سطح سے پست اس لیے کہ مجتہد کے بارے میں شاہ صاحب کا جو خیال ہے اسے وہ پہلے ظاہر فرما چکے اور عامی کی سطح سے بلند اس لیے کہ ارشادِ نبوی کا نسخ کا ان ذرائع سے علم، جو شاہ صاحب نے تحریر کیے ہیں، عامی کو نہیں ہو سکتا۔[۱۴]

۳- وہ شخص جو فقہاء میں سے کسی ایک فقیہ کی تقلید کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سے کسی اجتہادی رائے قائم کرنے میں غلطی ہونا ممکن نہیں ہے، اس نے جو اجتہاد کیا، جو رائے قائم کی اور جو فتویٰ دیا وہ بلا شک وشبہ صحیح ہے اور دل میں یہ بات بھی رکھتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کبھی نہیں چھوڑے گا اگرچہ اُس کی کسی رائے میں دلیل اُس کے خلاف ہو۔ قرآن اور سنت نے اس طرزِ عمل کی قباحت بیان کی جیسے عدی بن حاتم نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ آیت ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ﴾[۱۵] پڑھتے سنا: کافر لوگ اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کی بندگی نہیں کرتے تھے لیکن ان پر اتنا اندھا اعتماد تھا کہ وہ جس چیز کو حلال کہتے اُسے حلال سمجھتے اور جس چیز کو حرام کر دیتے اُسے اپنے اوپر حرام کر لیتے۔[۱۶]

۴- جو شخص اس چیز کو جائز نہیں سمجھتا کہ مثلاً کوئی حنفی، کسی شافعی سے یا کوئی شافعی، کسی حنفی سے فتویٰ لے اور نہ اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ کوئی حنفی کسی شافعی امام کی اقتداء کرے در حقیقت یہ وہ شخص ہے جس نے عہدِ اوّل کے طریقے اور صحابہ و تابعین کے اجماع کے خلاف کیا۔[۱۷]

گویا شاہ صاحب کے نزدیک مجتہد کے لیے ہر صورت میں اور عالم اور عامی کے لیے ان چار صورتوں میں تقلید حرام ہے جبکہ اس کے علاوہ دیگر صورتوں میں عالم اور عامی کے لیے شاہ صاحب تقلید کو واجب قرار دیتے ہیں۔

عامی کا حکم

یوں تو عامی کے لیے شاہ صاحب مذاہبِ اربعہ کی تقلید تک محدود رہنا ضروری سمجھتے ہیں لیکن جہاں تک مذہب معیّن کی بات ہے شاہ صاحب کے نزدیک اگر اتباعِ ہوی نہ ہو تو مذہبِ معین کی پابندی ضروری نہیں ہے۔[۱۸] کیونکہ عام آدمی کا کوئی معین فقہی مذہب نہیں ہوتا اس کا مذہب صرف مفتی کا فتویٰ ہے۔[۱۹]

تقلید کے عام ہونے کے اسباب

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

بعض اصحاب یہ گمان کرتے ہیں کہ اصحابِ فقہ میں صرف دو گروہ ہیں:

۱-اہل الظاہر ۲-اہل الرائے

تیسرا کوئی گروہ نہیں اور جو شخص بھی قیاس کرے اور استنباط کرے وہ اہل الرائے ہے ایسا ہرگز نہیں بلکہ رائے سے مراد فقط فہم و فراست نہیں ہے کیونکہ علماء میں سے کوئی بھی اس سے عاری نہیں۔ نہ وہ رائے ہے جس کا تعلق سنت سے بالکل ہی نہ ہو کیونکہ ایسی رائے تو کوئی بھی مسلمان ہرگز اختیار نہیں کرے گا اور نہ اخذِ مسائل و قیاس اس طرح ممکن ہے بلکہ اہل الرائے سے مراد وہ لوگ ہیں جو جمہور مسلمانوں کے متفقہ مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل کے اخذ کرنے میں کسی سابقہ امام کے اصول کو پیشِ نظر رکھنے پر اکتفا کریں لہٰذا اُن کے بیشتر مسائل کا انحصار سابقہ نظائر کی نظیر یا کسی سابقہ اصول پر منطبق ہو جائے نہ یہ کہ احادیث و روایات کی جستجو کریں اور اہل الظاہر وہ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثارِ صحابہ و تابعین سے جیسے امام داؤد، ابنِ حزم۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنت کا گروہ ہے جیسے امام احمد اور امام اسحٰق اور ان ہی میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو تقلید پر مطمئن ہو گئے اور تقلید ان میں رچ بس گئی۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

۱- فقہاء کا باہمی اختلاف و نزاع
۲- قاضیوں کا جور و ستم
۳- علمِ حدیث اور طرق تخریج سے بے بہرہ لوگ
۴- اجتہاد سے نابلد فقیہ۔[۲۰]

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب وہ تعصب میں پختہ ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کے درمیان بیشتر اختلافات خصوصیت کے ساتھ ان مسائل میں ہیں جن میں خود اقوالِ صحابہ باہم دیگر مختلف ہیں

مثلاً تکبیراتِ تشریق، تکبیراتِ عیدین، نکاحِ محرم، تشہد، نماز میں بسم اللہ اور آمین کو بلند آواز سے کہنا اور اقامت میں کلماتِ اذان کو ایک بار یا دو بار کہنے میں اختلاف۔

ان امور میں اختلاف صرف دو قولوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے بارے میں ہے۔ ان مسائل کی اصل مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ دونوں میں سے بہتر کیا ہے؟ اس اختلاف کی نظیر ایسی ہے جیسے قرآن کی قراءتوں میں اختلاف ہے۔[۲۱]

تقلید محض کا دور

فقہی مذاہب کے درمیان اختلاف کے حد سے تجاوز کر جانے کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اس بحث و اختلاف اور نکتہ چینی کا فتنہ بھی تقریباً ایسا ہی فتنہ تھا جیسا کہ پہلے لوگ حکومت کے لیے باہم متصادم ہوئے جس میں ہر شخص نے اپنے ساتھیوں کی حمایت کی اور جس طرح اس کے نتیجے میں جابر بادشاہ بر سر اقتدار آ گئے اور ہولناک واقعات رونما ہوئے۔ اسی طرح اس بحث و نزاع نے غیر متوقع جہالت، کھوٹ، شکوک اور اوہام کو جگہ دی۔ پھر ان کے بعد جو نسلیں آئیں اُن کی بنیاد محض تقلید ہوئی، اس میں نہ حق کو باطل سے امتیاز رہا اور نہ لڑائی جھگڑے کو اخذ مسائل سے۔ اب فقیہ وہ کہلاتا ہے جو زیادہ باتونی ہو، جس نے فقہاء کے اقوال یاد کر لیے ہیں، قوی اور ضعیف کی تمیز نہ ہو اور وہ انھیں باچھیں کھول کھول کر فر فر سنا سکتا ہو اور محدث وہ ہے جو صحیح اور سقیم احادیث کو گن سکتا ہو اور اپنے جبڑوں کے زور پر قصوں کی طرح فر فر بیان کر سکے۔''

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''میں یہ نہیں کہتا کہ سب ہی کا یہ حال ہے کیونکہ اللہ کے بندوں میں ایسے بھی ہیں جنھیں بدنام کرنے والا اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور ایسے لوگ ''حجۃ اللہ فی الأرض'' ہیں۔ اگرچہ یہ کم ہیں اس کے بعد کا عہد فتنہ اور تقلید میں زیادہ بڑھتا گیا۔ اس عہد کے لوگوں کے سینوں سے بصیرت کی امانت نکلتی گئی حتیٰ کہ وہ اُمور دینی میں ترکِ غور و خوض پر بالکل مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے:

﴿بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۲۲﴾''[۲۲]

آخر میں شاہ صاحب کہتے ہیں:

''و الی اللہ المشتكي وهو المستعان و به الثقة و عليه التكلان''[۲۳]

''اللہ ہی سے ہماری فریاد ہے اور وہی فریاد رس ہے اُسی پر بھروسہ ہے اور اُسی کا سہارا ہے۔''

مذکورہ بالا بحث سے مندرجہ ذیل اُمور واضح ہوتے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک:

۱- فقہی اختلاف عہد رسالت سے موجود ہے اور مختلف اسباب کے تحت اس کا دائرہ بڑھتا رہا۔
۲- اخذِ شریعت کے دو طریقے جاری ہوئے اور دونوں کی اصل دین میں موجود ہے البتہ ہر ایک طریقہ میں کچھ خلل ہے جس کی تلافی دوسرے طریقے سے ہوتی ہے۔
۳- فقہائے محدثین کی روش بہتر ہے جو اقوال مجتہدین کو اختیار کرتے ہیں اور حدیث پر انھیں پیش کرتے ہیں۔
۴- چار قسم کے افراد پر تقلید حرام ہے۔
۵- تقلید میں اعتدال پسندی ملحوظ رکھنی ضروری ہے۔
٦- اتباعِ ہوی نہ ہو تو (عامی کے لیے) مذہب معین کی پابندی ضروری نہیں۔

یہ ہے فقہی اختلافات اور اجتہاد و تقلید کے درمیان شاہ صاحب کا انتہائی معتدل اور مدلل موقف، جو اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ان کی تصانیف میں موجود ہے۔ شاہ صاحب کا موقف شریعت کے مصادرِ اصلیہ، صحابہ و تابعین کے عمل اور ائمہ مجتہدین کی روش سے ہم آہنگ ہے اور آج اُمت کے ٹوٹتے بکھرتے تانے بانے کو اس معتدل اور رواداری انہ موقف کی شدید ضرورت ہے۔[۲۴]

اس سے ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے شاہ صاحب کی عبارات سے عدمِ تقلید کا موقف اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، شاید انہوں نے ان حالات کا پس منظر نظر انداز کر دیا ہے جن میں در اصل شاہ صاحب نے بوقتِ ضرورت اتباعِ ھوٰی نہ ہونے کی صورت میں عامی کے لیے دوسرے مذہبِ فقہ کے نقطہ نظر کو اپنانے کی گنجائش دی تھی، اس سے غلط نتیجہ نکالا ہے جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ نبوی حکم ۲۵ کے مطابق شاہ صاحب بذات خود اور ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نہ صرف فقہِ حنفی کے عامل رہے بلکہ اسی کے مطابق افتاء کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

مصادر و مراجع

۱۔ ابو الحسن آمدي، احکام الاحکام في أصول الأحکام، مصر، محمد علي صبیح (۱۳۴۷ھ) ۱٦٦/۳۔ اس تعریف میں "حجۃ ملزمۃ" کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قولِ رسول ﷺ یا اجماع کی طرف رجوع یا عامی کا مفتی کی طرف یا قاضی کا قولِ عدول کی طرف رجوع اصطلاحاً تقلید نہیں کہا جاسکتا اس لیے ان میں سے ہر ایک "حجۃ ملزمۃ" ہے۔
۲۔ احکام کی دو قسمیں ہیں: عقلی اور شرعی۔ عقلی مسائل میں تقلید جائز نہیں۔ شرعی مسائل کی پھر دو قسمیں ہیں:

(۱)وہ مسائل جن کا رسول اللہ ﷺ کی شریعت سے ہونا بداہتًا معلوم ہو مثلاً ارکانِ اسلام کی ادائیگی، بدکاری اور شراب کی حرمت، ایسے مسائل میں بھی تقلید جائز نہیں (۲) وہ مسائل جو نظر و استدلال کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتے مثلاً عبادات، معاملات اور مناکحات وغیرہ کے فروع، تقلید کی گنجائش صرف انھی مسائل میں ہے۔(اللمع في اصول الفقه لابي اسحق الشيرازي، مصر، مصطفي البابي الحلبي، ط-۳ (۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء)، ص۷۰)

۳۔ الشوكاني، قاضي محمد، ارشاد الفحول الي تحقيق الحق من علم الاصول، مصر، مصطفیٰ البابي الحلبي، ط-۱ (۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء)، ص۲۶۷۔

۴۔ محوّلہ بالا۔

۵۔ شاہ ولي الله ، الانصاف في بيان سبب الاختلاف، لاہور، هيئة الاوقات بحكومة البنجاب، (۱۹۷۱ء)، ص، ۴۱-۴۲۔

۶۔ شاہ ولي الله، الانصاف في بيان سبب الاختلاف، ص۴۳-۴۵۔

۷۔ شاہ ولي الله، فيوض الحرمين مع سعادت دارين (تینتیسواں مشاہدہ)، حیدرآباد: شاہ ولي الله اكيدمي، ط- ۱، (۲۰۰۷ء)، ص۸۰۔

۸۔ الانصاف في بيان سبب الاختلاف، ص۵۰،۴۹۔

۹۔ ایضاً، ص۵۱،۵۰۔

۱۰۔ شاہ ولي الله، حجة الله البالغة، کراچی، قدیمی کتب خانہ، (س ن)، ۴۴۶-۴۴۷/۱۔

۱۱۔ ایضاً، ۴۴۷/۱۔

۱۲۔ (i)حجة الله البالغة، ۴۴۴/۱، (ii) شاه ولي الله ،عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد، دہلی :مطبع مجتبائی(۱۳۴۴ھ)، ص۳۶۔

۱۳۔ (i)حجة الله البالغة، ۴۴۴/۱،(ii) عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد، ص۳۶۔

۱۴۔ مظہر بقا، ڈاکٹر، اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی: بقا پبلیکیشنز،(۱۹۸۶ء)، ص۵۸۸۔

۱۵۔ سورة التوبہ(۹):۳۱۔

۱۶۔ (i) حجة الله البالغة، ۴۴۶/۱،(ii) عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد، ص۳۸۔

۱۷۔ (i)ایضاً، ۴۴۶/۱،(ii)ایضاً، ص۳۸،۳۹۔

۱۸۔ عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد، ص۹۷۔

۱۹۔ أیضاً، ص۷۸۔

۲۰۔ (i) حجة الله البالغة، ۴۴۰-۴۴۱/۱۔ (ii) الانصاف في بيان سبب الاختلاف، ص۳۸۔

۲۱۔ الانصاف في بيان سبب الاختلاف، ص۶۳۔

۲۲۔ سورة الزخرف(۴۳):۲۳۔

۲۳۔ (i) الانصاف في بيان سبب الاختلاف، ص۶۵،۶۶ (ii) حجة الله البالغة، ۴۴۱-۴۴۲/۱۔

۲۴۔ اختر امام عادل، مولانا، امام شاہ ولی اللہ اور اُن کے افکار و نظریات، لاہور، مکتبہ خلیل، ط ۱ (مئی ۲۰۰۵ء)، ص۳۳۰-۳۳۱

۲۵۔ فیوض الحرمین (تینتیسواں مشاہدہ)، ص۷۶-۷۸